ہوئے آئے اور کہا کہ پنڈت بدلو شاستری سیٹھ اتم چند اور لالہ مکھن لال باہر کھڑے دنگل مچا رہے ہیں کہتے ہیں کہ ہم کو بالا جی سے دو دو باتیں کر لینے دو۔ بدلو شاستری، بنارس کے نامی گرامی پنڈت تھے۔ خوبصورت ہلالی تلک لگاتے۔ سبز بانات کے مرزائی پہنتے اور بسنتی پگڑی باندھتے تھے۔ اتم چند اور لالہ مکھن لال دونوں شہر کے رئیس اعظم اور لکھ پتی آدمی تھے۔ خطاب کے لیے ہزاروں لاکھوں روپے خرچ کرتے اور اعلیٰ عہدیداروں کی تواضع اور تکریم و خاطر و مدارات فرض اولین سمجھتے تھے۔ ان حضرات کا شہر کے آدمیوں پر بڑا دباؤ تھا۔ بدلو شاستری جب کبھی شاستارتھ کرتے تو یہ یقینی بات تھی کہ فریق ثانی کی خیریت نہیں۔ خصوصاً بنارس کے پنڈے اور پراگوال اور اسی قبیل کے دوسرے مفت خور تو ان کے پسینہ کی جگہ خون بہانے کو تیار تھے۔ شاستری جی بنارس میں سناتن دھرم کے وکیل اور رکن اعظم مشہور تھے۔ اتم چند اور مکھن لال بھی مذہبی جوش و خروش سے لبریز تھے۔ اس وقت ان کی تشریف آوری فتنہ انگیزی سے کم نہ تھی۔ سناتن دھرم کا فرض اولین تمدن کے نقائص حمایت کرنا ہے اور چونکہ بالا جی کی روز افزوں کامیابیوں کو دیکھ کر ان کے کلیجے پر سانپ لوٹا رہتا تھا۔ اور یہ لوگ عرصہ سے بالا جی کے ساتھ شاستارتھ کرنے یا بالفاظ دیگر فوجداری کرنے کا موقع ڈھونڈ رہے تھے۔ آج ان کی دلی مرادیں بر آئیں۔ پنڈوں اور پراگوالوں کی ایک جمعیت کثیر لے کر آ پہنچے۔

بالا جی نے ان مہاتماؤں کے آنے کی خبر سنی تو باہر نکل آئے۔ مگر یہاں کی کیفیت دیکھی تو ہوش اڑ گئے۔ طرفین کے لوگ لاٹھیاں سنبھالے آستین چڑھائے گتھنے کو تیار تھے۔ شاستری جی پراگوں کو وار کرنے کے لیے للکار رہے تھے اور سیٹھ جی بلند میں آواز فرما رہے تھے کہ ان شودروں کی دھجیاں اڑا دو۔ ہم عدالت میں دیکھ لیں گے تمہارا بال بیکا نہ ہونے پائے گا۔ مکھن لال صاحب بھی گلا پھاڑ پھاڑ کر فرماتے تھے کہ نکل آئے جس میں بوتا ہو۔ ایک ایک کو سبز باغ دکھا دوں گا۔ بالا جی نے جب

یہ رنگ دیکھا تو راجہ صاحب سے بولے ''آپ بدلو شاستری کو جا کر سمجھا دیجیے کہ اس شر و فساد سے باز آئیں۔ ورنہ طرفین کا نقصان ہوگا اور جگ ہنسائی الگ ہوگی'' راجہ صاحب کی آنکھوں سے انگارے برس رہے تھے بولے ''اس شخص سے بات کرنا میں اپنی توہین سمجھتا ہوں اسے پراگوالوں کی جمعیت پر غرور ہے۔ مگر میں آج ان کی ساری شیخی کرکری کیے دیتا ہوں۔ ان کا منشا بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ آپ پر وار کریں مگر جب تک میں اور پانچوں بیٹے زندہ ہیں، کوئی آپ کی طرف آنکھ نہیں اٹھا سکتا۔ بس آپ کے ایک اشارہ کی دیر ہے اور میں دم کی دم میں انہیں اس شرارت کا مزہ چکھا دوں گا''

بالا جی سمجھ گئے کہ یہ شیر بپھر گیا ہے اس سے مصالحت کی امید رکھنی فضول ہے۔ راجپوت کی طرح بالا جی کے آنے سے مخالفین کی یہ فوج منتشر ہو گئی۔ کتنے ہی آدمیوں نے جو شر و فساد کی نیت سے آئے تھے، فرط عقیدت سے بالا جی کے روبرو سر جھکایا۔ اور ان کے عقیدت مندوں کے زمروں میں شامل ہو گئے۔ بدلو شاستری نے ہر چند چاہا کہ پنڈوں کے تعصب کو مشتعل کریں۔ مگر نا کام رہے۔

اس وقت بالا جی نے ایک نہایت پر زور تقریر کی جس کا ایک ایک لفظ آج تک سننے والوں کے دلوں میں منقوش ہے اور جو اہل ہند کے لیے ہمیشہ مشعل کا کام کرے گا۔ بالا جی کو یوں تو بہت سی تقریریں ہیں مگر وہ جوش، وہ شعلہ اور وہ بلندی جس سے وہ تقریر مرصع ہے، ان کی کسی تقریر میں نظر نہیں آتی۔ انہوں نے جادوئے کلام کے زور سے چند لمحوں میں پنڈوں کو اہیروں اور پاسیوں سے گلے ملا دیا۔ اس جادو صفت تقریر کے یہ آخری الفاظ تھے۔

''اگر آپ مستقل مزاجی سے کام کرتے چلے جائیں تو ضرور ایک دن آپ کو منزل مقصود کا سنہرا مینار دکھائی دے گا مگر استقلال کو کبھی ہاتھ سے نہ جانے دینا استقلال اور طاقت ہی زبردست قوت ہے۔ استقلال مردانہ خوبیوں کا بادشاہ ہے۔ استقلال

اور صاف دلآوری کا جوہر ہے۔ اسے ہرگز ہاتھ سے نہ جانے دینا۔ تمہارے سامنے آزمائشیں آئیں گی۔ تمہیں متواتر مایوسیوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ناکامیاں تمہاری عناں گیر ہوں گی۔ ایسی حالتوں میں سوائے استقلال کے تمہارا کوئی قابل اعتماد رہنما نہ ہوگا۔ استقلال اگر کامیاب نہ بھی ہو سکے تو دنیا میں اپنا نشان چھوڑ جاتا ہے''

جب بالا جی مکان کی طرف چلے تو آفتاب گوشہ مغرب میں چھپ رہا تھا۔ انہیں چوک کی رونق اور زندہ دلی دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ آج شہر والوں نے اس حبیب وطن کی آمد کی مبارکباد میں شہر کو چراغاں کرنے کی تیاریاں کی تھیں۔ سڑک کے دونوں طرف محرابیں بنائی جا رہی تھیں۔ چوراہوں پر رفیع الشان پھاٹک کھڑے تھے۔ اور دکانوں پر جھاڑ فانوس اور ہانڈیاں زیب دے رہی تھیں۔ اس عام مسرت کے جوش میں لوگ اپنے ذاتی دکھڑے بھول گئے تھے۔ مگر اتفاقات نے کچھ ایسی صورت اختیار کی کہ مسرت کے یہ سارے سامان درہم برہم ہو گئے۔ بالا جی نے مکان پر پہنچ کر اخبار کھولا تو چہرہ زرد ہو گیا اور دل دردمند سے ایک ٹھنڈی سانس نکل آئی۔

راجہ صاحب نے گھبرا کر پوچھا ''خیریت تو ہے؟''

بالا جی: ''سندیا میں طوفان آ گیا اور دریا کا باندھ پھٹ پڑا۔ دس ہزار آدمی تباہ ہو گئے۔ جب بپھرتا ہے تو اسے مرنے مارنے کے سوائے اور کوئی خیال نہیں رہتا بولے ''راجہ صاحب آپ دور اندیش ہو کر ایسی باتیں کرتے ہیں یہ موقع ایسی باتوں کا نہیں ہے۔ آگے بڑھ کر اپنے آدمیوں کو روکیے ورنہ نتیجہ بہت برا ہوگا''

بالا جی یہ کہتے کہتے رک گئے۔ سمندر کی لہروں کی طرح لوگ ادھر ادھر اڈتے چلے آتے تھے۔ ہاتھوں میں لاٹھیاں اور آنکھوں میں خون کی سرخی۔ چہرے غضب ناک۔ تیوروں پر بل پڑے ہوئے تھے۔ دیکھتے دیکھتے یہ جماعت کثیر پرا گوالوں کے سر پر پہنچ گئی اور قریب تھا کہ لاٹھیاں سروں کا بوسہ لیں۔ اور سنگینیں کلیجوں میں

چھپیں کہ بالا جی بجلی کی طرح کوند کر ایک گھوڑے پر سوار ہو گئے۔ اور نہایت پر زور لہجہ میں فرمایا۔

''بھائیو! یہ کیا اندھیر ہے۔ اگر مجھے اپنا دوست سمجھتے ہو، تو فوراً ہاتھ نیچے کر لو۔ اور پیروں کو ایک انچ آگے مت بڑھنے دو۔ مجھے فخر ہے کہ تمہارے دلوں میں مردانہ غصہ اور جوش ہے۔ مگر مردانہ ضبط اس سے بھی زیادہ پاک اور مقدس ہے۔ اس وقت اپنے غصہ کو ضبط سے روکو۔ کیا تم اپنی قوم کے ساتھ کل فرائض ادا کر چکے کہ یوں جان دینے پر آمادہ ہو۔ کیا تم مشعل لے کر بھی کنوئیں میں گرنا چاہتے ہو۔ یہ لوگ تمہارے دشمن نہیں۔ تمہارے بھائی تمہارے ہی خون ہیں۔ انہیں اپنا دشمن مت سمجھو! اگر وہ جاہل ہیں تو ان کی جہالت کو دور کرنا تمہارا فرض ہے۔ اگر وہ تمہیں گالیاں دیں تو تم برا مت مانو۔ اگر وہ تم سے لڑنے پر آمادہ ہوں تم سلامت روی اختیار کرو۔ اور ایک ہوشیار حکیم کی طرح اپنے بدمزاج مریضوں کے علاج کرنے میں مصروف رہو۔ میں نے تم کو با آواز بلند منع کر دیا۔ اگر میرے حکیم کے خلاف تم نے ہاتھ اٹھایا تو وہ قوم کا دشمن ہوگا''

ان پر زور الفاظ نے چوطرفہ سکوت کا عالم طاری کر دیا۔ جو جہاں تھا وہیں نقش بہ دیوار بن گیا۔ اس ایک شخص کی آواز میں قیامت کا اثر تھا۔ جس نے پچاس ہزار آدمیوں کے امڈتے ہوئے جوش کو فرو کر دیا۔ جیسے کوئی ہوشیار کوچبان شریر گھوڑے کو روک لیتا ہے۔ اور یہ طاقت کس نے دی تھی؟ نہ اس کے سر پر تاج شاہی تھا، نہ وہ کسی فوج کا سپہ سالار تھا۔ یہ صرف اس پاک اور قومی بے غرض خدمت کا جذبہ تھا جو اس نے سرانجام دیا تھا۔ خادم قوم کے اعزاز و امتیاز کا پیمانہ وقربانیاں ہوتی ہیں جو وہ اپنی قوم کے لیے کرتا ہے۔

پنڈوں اور پراگوالوں نے بالا جی کی پر جلال صورت دیکھی اور پر زور آواز سنی تو ان کا جوش بھی سرد ہو گیا جس طرح آفتاب کے نکلتے ہی کہرا چھٹ جاتا ہے۔

دھرم سنگھ: ''اف!''

بالا جی: ''ہزاروں آدمی سیلاب میں بہہ گئے۔ سارا شہر مسمار ہو گیا۔ مکانوں کی چھتوں پر کشتیاں چل رہی ہیں۔ ارجن سبھا کے لوگ پہنچ گئے ہیں۔ اور حتی الوسع آدمیوں کو تباہ ہونے سے بچا رہے ہیں مگر ان کی تعداد بہت کم ہے''

دھرم سنگھ: ''(چشم پر آب ہو کر) یا ایشور تو ان غریبوں کا مالک ہے''

بالا جی: ''گوپال گئو شالہ بہہ گیا ہے۔ ایک ہزار گائیں سیلاب کی نذر ہو گئیں۔ تین گھنٹہ لگاتار مینہ برستا رہا 16 انچ پانی گرا، شہر کے جنوبی حصہ میں ساری آبادی جمع ہے۔ نہ رہنے کو مکان ہے نہ کھانے کو دانہ لاشوں کا انبار لگا ہوا ہے۔ بہت سے لوگ بھوکوں مرے جاتے ہیں اور لوگوں کے نالہ وشیون سے کلیجہ منہ کو آیا جاتا ہے۔ سب مصیبت زدہ آدمی بالا جی کو بلانے کی رٹ لگا رہے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ میرے پہنچنے سے مصیبتیں رفع ہو جائیں گی''

تھوڑی دیر تک بالا جی آنکھیں بند کیے گہرے خیال میں ڈوبے بیٹھے رہے۔ بعد ازاں بولے ''میرا جانا ضروری ہے۔ میں اسی وقت جاؤں گا آپ سدیا کے ارجن سبھا کو تار دے دیجئے کہ وہ اس کام میں میرا ہاتھ بٹانے کو تیار رہیں''

راجہ صاحب نے منت آمیز لہجہ میں کہا ''ارشاد ہو تو میں بھی ساتھ چلوں''

بالا جی: ''میں وہاں پہنچ کو آپ کو اطلاع دوں گا۔ میرے خیال میں آپ کے جانے کی ضرورت نہ ہو گی''

دھرم سنگھ: ''بہتر ہوتا آپ علی الصباح جاتے''

بالا جی: ''جی نہیں مجھے یہاں لمحہ بھر ٹھہرنا مشکل گزر رہا ہے۔ ابھی مجھے وہاں تک پہنچنے میں کئی دن لگیں گے''

دم کے دم میں سارے شہر میں یہ خبر پھیل گئی کہ سدیا میں طوفان آ گیا۔ اور بالا جی اسی وقت جا رہے ہیں۔ یہ سنتے ہی ہزاروں آدمی بالا جی کو رخصت کرنے کے لیے

نکل پڑے۔ اور نو بجتے ہی دروزہ پر قربان پچیس ہزار آدمیوں کا مجمع ہو گیا۔ سدیا کی خبر ہر کس کی زبان پر تھیں۔ لوگ ان مصیبت زدوں کی حالت پر افسوس و ہمدردی کر رہے تھے۔ صدہا آدمی بالا جی کے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہو گئے۔ اور سدیا والوں کی امداد کے لیے ایک فنڈ کھولنے کے چرچے ہو رہے تھے۔

ادھر رانی دھرم سنگھ کے محل میں شہر کی خواتین نے آج سہاما کو مبارکباد دینے کے لیے ایک جلسہ کیا تھا۔ عالیشان حویلی کا ایک ایک گوشہ عورتوں سے بھرا ہوا تھا۔ پہلے برج رانی نے کئی عورتوں کے ساتھ ایک مبارکباد کا سہانا گیت گایا۔ اور اس کے بعد سب عورتیں حلقہ باندھ کر گاتی بجاتیں، آرتی کا تھال لیے سہاما کے مکان پر آئیں۔ سیوتی اور چندرا مہمانوں کا مصافحہ کرتے ہوئے پہلے ہی موجود تھیں۔ سہاما ہر ایک خاتون سے گلے ملی۔ اور انہیں دعا دی کہ تمہاری گود میں بھی ایسے ہی سپوت بچے کھیلیں گے۔ پھر رانی صاحبہ نے اس کی آرتی اتاری اور گانا ہونے لگا۔ آج مادھوی کا چہرہ پھول کی طرح کھلا ہوا تھا۔ کل کی طرح آج وہ مایوس و مغموم نہ تھی۔ آرزوئیں بس کی گانٹھ ہیں۔ انہیں آرزوؤں نے کل سے اتنا رلایا تھا مگر اس کا دل ان آرزوؤں سے خالی ہو گیا ہے۔ اسی لیے چہرہ شگفتہ اور آنکھیں روشن ہیں۔ بے آرزورہ کراس دیوی نے ساری زندگی کاٹ دی۔ مگر با آرزورہ کراس سے ایک دن کا دکھ بھی نہ جھیلا گیا۔

سہانے راگوں کے الاپ سے مکان گونج رہا تھا کہ یکا یک سدیا کی خبر یہاں بھی پہنچی اور راجہ دھرم سنگھ یہ کہتے ہوئے سنائی دیئے آپ لوگ بالا جی کو رخصت کرنے کے لیے تیار ہو جائیں وہ اسی وقت سدیا جا رہے ہیں

یہ سنتے ہی آدھی رات کی سی خاموشی چھا گئی۔ سہاما گھبرا کر اٹھی اور دروازہ کی طرف لپکی۔ گویا وہ بالا جی کو روک لے گی۔ اس کے ساتھ سب کی سب عورتیں اٹھ کھڑی ہوئیں اور اس کے پیچھے پیچھے چلیں۔ برج رانی نے کہا ''چچی! کیا انہیں زبردستی

رخصت کروگی ابھی تو وہ اپنے کمرے میں ہیں''

سباما: ''میں انہیں نہ جانے دوں گی رخصت کرنا کیسا؟''

برج رانی: ''ان کا سدیا جانا ضروری ہے''

سباما: ''میں سدیا کیا لے کر چاٹوں گی، بھاڑ میں جائے، آخر میں بھی تو کوئی ہوں، میرا بھی تو ان پر کوئی حق ہے''

برج رانی: ''تمہیں میری قسم اس وقت اس قسم کی باتیں نہ کرنا ہزاروں آدمی محض ان کے بھروسے پر جی رہے ہیں یہ نہ جائیں گے تو قہر ہو جائے گا''

محبت مادرانہ انسانیت اور قومیت کے احساس سے غالب آ گئی۔ مگر برج رانی نے سمجھا کہ روک لیا۔ سباما اس واقعہ کو یاد کر کے ہمیشہ افسوس کرتی تھی۔ اسے تعجب ہوتا تھا کہ میں آپے سے باہر کیوں ہوگئی تھی

رانی صاحبہ نے پوچھا ''برجن بالا جی کو جے مالا کون پہنائے گا''

برجن: ''آپ''

رانی صاحبہ: ''اور تم کیا کروگی؟''

برجن: ''میں ان کے ماتھے پر تلک لگاؤں گی''

رانی صاحبہ: ''مادھوری کہاں ہے؟''

برجن: ''(آہستہ سے) اسے نہ چھیڑو بیچاری اپنے خیال میں مگن ہے''

اسی اثناء میں بالا جی باہر نکلے۔ انہیں دیکھتے ہی لوگوں نے پرجوش نعرہ مارا بھارت کی جے عورتیں بھی ان کی طرف بڑھیں۔ بالا جی نے سباما کو دیکھا تو نزدیک آ کر اس کے قدم چوم لیے۔ سباما نے انہیں اٹھا کر چھاتی سے لگا لیا۔ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر وفور جذبات نے زبان نہ کھلنے دی۔ رانی صاحبہ پھولوں کی جے مالا لے کر چلیں کہ ان کے گلے میں ڈال دوں۔ مگر پیر تھرائے۔ اور آگے نہ بڑھ سکیں۔ برج رانی چندن کا تھال لے کر چلی۔ مگر آنکھیں ندی کی طرح امڈ آئیں۔ اور دل بیٹھ گیا۔ تب مادھوی

چلی۔ اس کی آنکھوں میں پریم کی چمک تھی اور چہرے پر پریم کی سرخی، ہونٹوں پر دلآویز مسکراہٹ اور دل پریم کے نشہ میں مگن تھا۔ اس نے بالا جی کی طرف ایسی نگاہوں سے دیکھا جو اتھاہ محبت سے لبریز تھیں اور تب سر نیچا کر کے پھولوں کی جے مالا گلے میں ڈال دی۔ ماتھے پر چند کا ٹیکہ لگایا اور پریم کا بیڑا ہاتھ میں دے دیا۔ مراسم ظاہری کی کسر تھی وہ بھی پوری ہوگئی۔ اس وقت بالا جی نے گہری سانس لی۔ اور انہیں معلوم ہوا کہ میں پریم کے اتھاہ سمندر میں بہا جا رہا ہوں۔ ضبط اکھڑ گیا اور اس شخص کی طرح جو یکا یک پانی میں پھل پڑا ہو انہوں نے بے اختیار مادھوی کی بانہہ پکڑ لی مگر آہ! جس تنکے کا انہوں نے سہارا لیا وہ خود پریم کی دھارا میں تیزی سے بہا جا رہا تھا۔ ان کا ہاتھ پکڑتے ہی مادھوی کے رگ رگ میں بجلی سی کوند گئی۔ بدن میں پسینہ آ گیا اور جس طرح ہوا کے جھونکے سے پنکھڑیوں پر جمیل ہوئے شبنم کے قطرے زمین پر گر پڑے ہیں۔ اسی طرح مادھوی کی آنکھوں سے آنسو کی بوندیں بالا جی کے ہاتھ پر پڑیں۔ یہ پریم کے موتی تھے۔ جو ان متوالی آنکھوں سے بالا جی کے بھینٹ کیے۔ آج سے یہ آنکھیں پھر نہ روئیں گی۔ آسمان پر تارے چمکے ہوئے تھے۔ اور ان کی آڑ میں بیٹھی ہوئی دیویاں یہ نظارہ دیکھ رہی تھیں آج صبح بالا جی کے خیر مقدم میں یہ نغمہ گایا جا رہا تھا۔

بالا جی تیرا آنا مبارک ہوئے

اور اس وقت عورتیں اپنے دلکش اور من بھاونے سروں میں گا رہی تھیں

بالا جی تیرا جانا مبارک ہوئے

آنا بھی مبارک تھا اور جانا بھی مبارک ہے۔ آنے کے وقت بھی آنکھوں سے آنسو نکلے تھے اور جانے کے وقت بھی آنسو نکل رہے ہیں۔ کل وہ مہمان کا خیر مقدم کرنے کے لیے آئے تھے۔ آج اسے الوداع کر رہے ہیں۔ ان کا رنگ روپ بالکل یکساں ہے، مگر ان میں کتنا فرق ہے۔

متوالی جوگن

مادھوی پہلے ہی مرجھائی ہوئی کلی تھی۔حسرت نے اسے خاک میں ملا دیا۔بیس سال کی تپسونی جوگن بن گئی۔اس غریب کی بھی کیا زندگی تھی کہ یا تو دل میں کوئی آرزو پیدا ہی نہیں ہوئی، ہوئی تو قسمت نے اسے پھلنے پھولنے نہ دیا۔اس کا پریم عشق کا دریائے بے کنار تھا۔اس میں ایسا سیلاب آیا کہ زندگی کی آرزوئیں اور حسرتیں فنا ہوگئیں۔اس نے جوگنوں سے وستر پہن لیے اور علائق اور حسرتیں فنا ہو گئیں۔دنیا انہی ارمانوں اور آرزوؤں کا دوسرا نام ہے۔جس نے انہیں گور حسرت میں دفن کر دیا۔اسے دنیا سمجھنا بھول ہے۔

اس پریم کے نشہ میں متوالی جوگن کو ایک قیام نہ تھا۔بوئے گل کی طرح دیش دیش بچرتی اور پریم کے شبد سناتی پھرتی تھی۔اس کے زرد چہرے پر گیروے رنگ کی کفنی بہت سہانی معلوم ہوتی تھی۔یہ پریم کی مورت کو دیکھ کر لوگوں کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑتے۔جب وہ اپنی بین پر کوئی بھجن گانے لگتی تو سننے والوں کے دل پریم اور انوراگ سے سرشار ہو جاتے۔اس کا ایک ایک شبد پریم رس میں ڈوبا ہوا تھا۔

متوالی جوگن کو بالا جی کے نام سے عشق تھا۔وہ اپنے پدوں میں اکثر ان کی کیرت سناتی تھی۔جس دن سے اس نے جوگیا بھیس اور لوگ لاج کو پریم پر نچھاور کر دیا، اسی دن سے گویا سرسوتی اس کی زبان پر بیٹھ گئیں۔اس کے رسیلے پد سننے کو لوگ سینکڑوں کوس سے چلے آتے تھے۔جس طرح بنسی کی صدا سنتے ہی گوپیاں گھروں سے بےقرار ہو کر نکل پڑتی تھیں۔اسی طرح اس جوگن کی تان سنتے ہی انسانوں کا دریا امڈ پڑتا۔اس کے پد سننا آنند کے پیالے پینا تھا۔

اس جوگن کو کسی نے ہنستے یا روتے نہیں دیکھا۔اسے نہ کسی بات کا رنج تھا۔نہ کسی بات کی خوشی، جس دل میں آرزوئیں نہ ہوں وہ کیوں ہنسے اور کیوں روئے۔اس کا